برِّصغیر ہند و پاکستان میں اسلامی تحریک کی تاریخ

(مولانا مسعود عالم صاحب ندوی)

[یہ وہ مقالہ ہے جو مولانا نے جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع عام منعقدہ کراچی میں پیش فرمایا تھا]

ہندوستان میں اسلام کی عام حالت | یوں تو ہندوستان پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام کی روشنی سے منور ہو چکا تھا، اور یہ سرزمین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بابرکت قدموں سے بھی محروم نہیں رہی تھی، پر یہ بھی حقیقت ہے کہ آفتاب اسلام کی پہلی کرنیں ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ عرب تاجر اور جہازراں جو جنوب مغربی ساحل سے گذر کر سیلون اور جزائر شرق الہند کا رُخ کرتے تھے، ملک کے اندرونی علاقوں میں کم آتے۔ اسی طرح سندھ کا نامور فاتح محمد بن قاسم بھی اپنی مہم کو ادھورا چھوڑ کر واپس لوٹنے پر مجبور ہوا۔ اس ملک اور خاص کر شمالی خطے کی بدنصیبی کہیے، کہ یہ عرب فاتحوں کے دم قدم سے محروم رہا۔ ان کی جگہ، اس کے حصے میں ایسے فاتح اور کشور کشا آئے، جو خود نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہ ترک اور مغل فاتح، اسلام بھی اس وقت لائے جب خود اس کے تہذیبی مرکزوں (بخارا، عراق، شام) میں انحطاط رونما ہو چکا تھا اور عباسی حکومت نومسلم غلاموں کے ہاتھوں میں بچوں کا کھلونا بن گئی تھی۔ یہ لوگ عام طور پر اسلام کے قانونِ جنگ سے ناواقف تھے اور ان کی فوج میں بڑی تعداد نومسلموں کی تھی۔ تعلیم و تربیت کے لحاظ سے حالت اور بھی خراب تھی۔ محمود غزنوی سے پہلے اُن کے ہاں مدرسوں کا رواج ہی نہیں تھا اور یہی وجہ ہے کہ درۂ خیبر سے آنے والی اکثر قومیں اسلامی تعلیمات سے اکثر بے بہرہ رہیں۔ ان بادشاہوں اور کشور کشاؤں کے کارنامے ملک گیری اور جنگی صلاحیتوں کے لحاظ سے جو بھی قدر و قیمت رکھتے ہوں، مگر اسلامی تعلیم اور اسلامی نظامِ حکومت و عدل کے عملی مظاہرے کے اعتبار سے ان کی کوئی خاص قیمت نہیں۔ بلکہ تلخ بیانی معاف، ان بادشاہوں کی عملی زندگی اور ان کے سیاسی طرزِ عمل نے اسلام کے متعلق ایسی بے شمار غلط فہمیاں پیدا کر دیں، جو ایک مدت کی مسلسل اور

پیہم کوششوں کے باوجود آج تک دُور نہیں ہو سکی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس ملک کے بڑے حصّے میں اسلام کے ایسے پیام بر آئے جو خود اسلام کی تعلیم سے اچھی طرح واقف نہ تھے، اور تھوڑی بہت واقفیت تھی بھی، تو اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق انہیں کم ہی میسّر ہوئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ دین جو ایک عقیدہ اور ہمہ گیر نظامِ زندگی کی حیثیت سے تمام ادیان اور نظامہائے حیات پر غالب ہونے کے لیے آیا تھا، ہندوستان پہنچ کر شرک اور جاہلیت کے انبار میں دب کے رہ گیا۔ حجاز سے توحید کا جو صاف و شفاف چشمہ رواں ہوا تھا، گنگا اور جمنا کی آویزش نے اسے گدلا کر دیا؛ توحیدی عقائد شرک کی آلودگیوں میں لت پت ہو گئے، اور دینِ حق کا مُستحکم نظامِ زندگی جاہلیت کے طور طریقوں سے بُری طرح مسخ ہوا۔

ہم یہ جانتے ہیں، اور خود اس ملک کے غیر مسلموں نے بھی اسے مانا ہے، کہ اس سرزمین پر اسلام کے بڑے احسانات ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس سرزمین میں اسلام پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں اور یہاں اسلام قبول کرنے والوں نے اپنی کوتاہیوں کے باوجود جتنا کچھ بھی اسلام کا علم پھیلایا اور جس قدر بھی، تھوڑا یا بہت، اس پر عمل کیا، اُس کی بدولت یہاں کے عقائد، اخلاق، تمدن اور تہذیب میں بڑی اصلاحات رونما ہوئیں، تو اُس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ یہاں کے جو اثرات بیرونی مسلمانوں نے قبول کیے اور جو اثرات ملکی مسلمانوں میں باقی رہے، انہوں نے نہ صرف اسلامی نظامِ زندگی کو مسخ کیا بلکہ خود اسلام کے عقائد اور تصورات و نظریات تک میں غلط قسم کی آمیزشیں کر دیں۔ یہ وہ خرابی ہے جسے زمانہ گذشتہ میں ہر دَور کے مصلحین نے محسوس کیا ہے اور اسے دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خصوصاً حضرت مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) کے عہد سے لے کر آج تک ساڑھے تین سو برس ہو چکے ہیں کہ اس کی اصلاح کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں، مگر اس کے باوجود صدیوں کا یہ بیٹھا ہوا زنگ پُوری طرح دُور نہیں ہو سکا۔

دسویں صدی ہجری سرزمینِ ہند میں اسلام کی یہ عام حالت تھی۔ کم و بیش ہر دَور میں ہندوانہ اسلام

دل و دماغ پہ چھایا رہا۔ مگر دسویں صدی ہجری سے پہلے کفر و شرک کی یہ تاریکی اپنی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔ گجرات اور سندھ کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر، جن کے تعلقات عرب ملکوں سے قائم تھے، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ تصوف کو اشراقی اور ویدانتی فلسفوں نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا، ہر طرف بدعات کی گرم بازاری تھی۔ زندگی کا کوئی شعبہ مشرکانہ اثرات سے پاک نہیں رہا تھا۔

اس زبوں حالی کی بڑی وجہ کتاب و سنت کی تعلیم سے غفلت اور بے پروائی تھی۔ اس غفلت کا بڑا سبب یہ ہے کہ شمالی ہند میں دین کی طرح علم بھی ماوراء النہر سے آیا۔ بعض اسباب کے تحت علمائے ماوراء النہر کی علمی پرواز فقہ اور اصول فقہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اس لیے شمالی ہند میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ فقہ و اصولِ فقہ تک محدود رہا، اور یہاں بھی فقہا کے متون کو اصلِ دین کی سی اہمیت دی جانے لگی۔ قرآن و حدیث سے بے خبری کی صورت میں ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا۔ گجرات اور ساحلی علاقوں میں عرب ملکوں سے اہلِ علم کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے وہاں تو حَدَّثَنَا وَاَخْبَرَنَا کا غلغلہ بلند ہوتا رہا، مگر اس خوش نصیب علاقے میں بھی حدیث و سنت کی چہل پہل اُسی وقت تک رہی جب تک شمالی ہند کا سایہ اس پر نہیں پڑا۔ بیچ کی دو صدیوں (۷۹۹ھ - ۹۸۰ھ) میں وہ مرکزی حکومت کے دباؤ سے محفوظ رہا اور علم و عمل کی خوب گرم بازاری رہی۔ جب اکبر (۹۶۳ - ۱۰۱۴ھ) نے گجرات کا صوبہ بھی اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تو وہاں بھی وہی جہل و تاریکی لوٹ آئی۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ شمالی ہند کے کان حدیث سے بالکل ناآشنا رہے۔ البتہ عرض یہ کرنا ہے کہ شیخ عبدالحق (ف ۱۰۵۲ھ)، بلکہ شاہ ولی اللہ دہلوی (ف ۱۱۷۶ھ) سے پہلے اس خطے میں حدیث کا عام چرچا نہیں ہوا۔ دسویں صدی ہجری سے پہلے شمالی ہند میں صرف ایک جلیل القدر محدث حسن (ف ۶۵۰ھ) کا نام ملتا ہے۔ پھر تین صدیوں کے بعد شیخ علی متقی (ف ۹۷۵ھ) مسند درس پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان دو ناموں اور ان کے کارناموں سے شمالی ہند کے اربابِ اقتدار اور اصحابِ علم کی کوتاہیوں کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔

دسویں صدی ہجری تک اس برصغیر کی عام حالت یہی تھی۔ گو اللہ کی زمین نیک بندوں سے بالکل خالی بھی نہیں رہی۔ صلحائے امت انفرادی طور پر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہے۔ بادشاہوں میں محمد تغلق (۷۲۵-۷۵۲ھ)، فیروز تغلق (۷۵۲-۷۹۰ھ) اور سکندر لودی (۸۹۴-۹۲۳ھ) کے نام ملتے ہیں، جنہوں نے اپنی صوابدید اور ہمت کے مطابق صورت حال کے بدلنے کی کوشش کی۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ صحیح الفکر اہل علم کے فقدان، دین سے عام بیخبری اور خاص طور پر اسلام کے ملکی اور جنگی قانون سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بسا اوقات ایسے کام بھی کر جاتے تھے جن کی قانونِ شریعت کے اندر مشکل ہی سے گنجائش نکل سکتی ہے۔ بہرحال اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ میں ان نیک دل اور خدا ترس بادشاہوں کا ایک خاص مقام ہے، جسے اسلامی تحریک کا مؤرخ کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔

دسویں صدی ہجری سے پہلے کی ان اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء کا حصہ نمایاں نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح عالم دین بہت کم تھے، اور جو تھے اُن کا بھی بڑا حصہ اپنے فرائض سے بالکل غافل تھا۔ البتہ جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے، کچھ باعمل اور خلوت نشین صوفی ضرور تھے، جو اپنی اپنی جگہ دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے۔ اور یہ ان ہی بزرگوں کی خاموش دعوت کا اثر ہے کہ اس ملک میں اسلام کی بو باس نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خلوت نشین اور شب زندہ دار صوفی نہ ایسے ذرائع رکھتے تھے کہ یہاں کے عوام میں اسلام کا علم وسیع پیمانے پر پھیلا سکتے، اور نہ حکومت کی مدد کے بغیر یہی ممکن تھا کہ تنہا ان کی کوششوں سے مسلمانوں کی روز افزوں آبادی بدعات اور مشرکانہ عقائد اور جاہلیت کی رسموں سے محفوظ رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ان بزرگوں کے فیضِ نظر سے داخل اسلام ہوتے تھے، وہ خود ان ہی بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا بیٹھے اور جہالت نے انہیں مرکزوں کو بدعات کی آماجگاہ بنا کر چھوڑا جہاں سے خلقِ خدا کو اسلام کی نعمت نصیب ہوتی تھی۔

دورِ ضلالت ۹۶۴-۱۰۱۴ھ | دسویں صدی ہجری اور اس سے پہلے جو مسلمان بادشاہ تختِ

حکومت پر جلوہ افروز ہوتے وہ کم سے کم دین سے عناد نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں محمد تغلق اور فیروز تغلق جیسے صالح اور دردمند فرمانروا بھی ہوتے ہیں، جنہوں نے دین کی خدمت اور اصلاح حال کی اپنی سی کوشش میں کوتاہی نہیں کی۔ مغلوں کا رنگ شروع ہی سے بدلا ہوا تھا۔ خود تیمور نے قتل و غارت میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ ہمایوں اپنی پریشاں حالی اور سرگشتگی کے بعد ایران سے واپس آیا تو ایسا تحفہ لے کر، جو بعد میں اسلامی ہند کا ایک پیچیدہ اور مستقل مسئلہ بن گیا۔ لیکن جس مغل بادشاہ کے دور میں اسلام اور مسلمانوں پر زمین تنگ کرنے کی کوشش کی گئی اور دین و شعائر دین کی بے حرمتی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا گیا، وہ اکبر ہے

یہ نوعمر اور ان پڑھ بادشاہ ۹۶۳ھ میں تخت و تاج کا وارث ہوا اور اس نے پورے پچاس برس حکومت کی۔ اس کے کان میں کسی شیطان نے پھونک دیا کہ "اب نبی عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، دوسرے ہزار میں نئے دین اور نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ وہ پرانا دین اب کام نہیں دے سکتا"۔ جادو کام کر گیا اور گم کردہ راہ مصاحبوں اور درباریوں کی سازش سے ایک نئے مذہب (دین الٰہی) کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک محضر نامہ پیش کیا گیا (۹۸۷ھ)، جس کا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ ظل اللہ ہے۔ امام عادل ہے مجتہد العصر ہے کسی کا پابند نہیں۔ اس کا حکم سب پر بالا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اسے معصومیت کی سند دے دی گئی اور وہ آئے دن دین میں من مانی ایجادات کرنے لگا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ اس نے شیعہ مذہب بھی اختیار کیا تھا اور سنی علماء پر بڑی سختیاں کی تھیں بعضے کہتے ہیں کہ وہ تصوف کی طرف مائل تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہم اسے مذہب کے باب میں خبطی کہہ سکتے ہیں۔ آفتاب اور آگ کے سامنے سر عقیدت خم کرنا بھی اس سے منقول ہے۔ حضرت مریم کو معبود بنانا اور سناروں کی پرستش بھی اس کی طرف منسوب ہے۔ اور تو اور اپنی عقل کو بھی وہ معصوم سمجھنے لگا تھا۔

اس خبط اور دماغی عدم توازن کے ساتھ اسلام اور شعائر اسلام سے اس کی نفرت بھی حد سے

زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ ملازموں کو محمد اور احمد کے ناموں سے پکارا کرتا کہ دکھا کر بدبین احترام نبوت کی تخفیف ہو ہجری تقویم کے بدلے "الٰہی تقویم" جاری کی جس کا آغاز اس کی تخت نشینی کے سال سے کیا گیا۔ شراب اور قمار بازی کے کھلم کھلا مباح کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ گاؤ کشی بالکل بند کر دی گئی۔ مسجدیں بھی منہدم کی گئیں ــــــ دوسری طرف غیر مسلم بیویوں کی وجہ سے قصر شاہی میں ہندو تہذیب و معاشرت کا سکہ چلنے لگا۔ ان کے لیے قصر میں خاص عبادت خانے بنائے گئے۔ بتوں کی پوجا کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ہندو تہواروں کے موقع پر عام عید منائی جاتی مختصر یہ کہ سارا ماحول ہندوانہ ہو گیا۔

فتنۂ اکبری کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اس مختصر تحریر میں سرسری اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ایک چیز رہی جاتی ہے جس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ دورِ اکبری کی اس گمراہی اور کج روی کا بڑا سبب "علماء سوء" ہیں۔ ان کی باہمی رقابت، مال و متاعِ دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی طلب، اور اس پر دین کے سطحی علم نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ یہ اُن علماء سوء کی پست ہمتی، بزدلی اور دنیا طلبی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایک ایسے محضر نامہ پر دستخط کر دیے، جو حقیقت میں دین و مذہب کا "قتل نامہ" تھا۔ اس لیے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اس فتنہ کی پرورش و پرداخت میں علماء سوء کا بڑا حصہ تھا۔

دورِ اکبری کے ابن حنبل، حضرت مجدد الف ثانیؒ بالکل بجا ارشاد فرماتے ہیں :۔

"ہر فتورے کہ دریں زمان در ترویج ملت و دین ظاہر گشتہ از شومئ علماء سوء است کہ فی الحقیقت شرار مردم و لصوص دین اند۔ اُولٰئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ۔ اَلَا اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ط"

مجدد الف ثانیؒ ۹۷۱ - ۱۰۳۴ھ اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اُس موڑ پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صحیح اسلامی رہنمائی شروع ہوتی ہے۔ زمین تپتی ہے تو بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ جب اکبری دور کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھ گئیں اور سچے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگا، تو قدرت نے ایک درویش کو خلعتِ تجدید عطا فرمایا، جس نے دیوتاؤں کی اس سرزمین میں پہلی مرتبہ صحیح اسلامی رہنمائی کا علم بلند کیا، کفر و شرک کی اندھیاری میں کتاب و سنت کی شمع روشن کی، توحید

خالص کا بول بالا کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ "افضل الجہاد" کی سنت زندہ کی ——— آپ سمجھے! یہ درویش کون تھا؟ احمد بن عبدالاحد فاروقی سرہندی، مجدد الف ثانیؒ۔ اُن کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں! سچ یہ ہے کہ وہ مجدد کہے جانے کے مستحق ہیں۔ حسین بن علیؓ احمد بن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ نے اپنے اپنے زمانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے تھے، وہی خدمت اس بوریا نشین درویش نے انجام دی اور اُسی شانِ استغنا و محبوبیت کے ساتھ جو ازل سے مقربینِ بارگاہ کا خاصہ رہا ہے۔

مجدد صاحبؒ کی نشو و نما دسویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ وہ سنِ رشد کو پہنچتے ہی اس فتنے کے عواقب کو بھانپ گئے اور اس کے مقابلے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ دور و نزدیک ہر طرف مریدوں کا جال پھیلا دیا۔ حکومت کے افسروں اور فوج کے سپہ سالاروں پر تبلیغ شروع کر دی لیکن ان کی دعوت کے اثرات جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ظاہر ہوئے، جبکہ یہ فتنہ پورے شباب پر تھا۔ اس وقت وہ کھل کر میدان میں آ گئے۔ منکرات و بدعات کی بیخ کنی میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ بے شمار مخلوقِ خدا آپ کے ہاتھوں ہدایت پذیر ہوئی۔ اوّل اوّل تو حکومت نے سختی نہ کی، مگر جب کلمۂ حق و اُسکاف بلند ہوا تو جبینِ اقتدار پر شکن آ گئی۔ دربار میں طلبی ہوئی۔ مجاہد نے وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ انسان، انسان کو سجدہ کرے، ایک موحد یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ حضرت مجدد نے سرِ دربار ان بدعات و منکرات کی مذمت کی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیئے گئے۔ مگر مردِ حق آگاہ وہاں بھی اپنے کام میں مشغول رہا۔ دیکھتے دیکھتے قید خانہ کی کایا پلٹ ہو گئی۔ تب حکومت کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ بادشاہ نے دعوت دی۔ ولی عہد نے استقبال کیا۔ وقت کے مصلح و مجدد نے ان موقعوں سے پورا فائدہ اٹھایا اور دورِ اکبری کی منکرات و بدعات کی منسوخی عمل میں آ گئی اور تقریباً نصف صدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد ایک مرتبہ پھر اس ملک میں اسلام کو سربلندی حاصل ہوئی۔

مجدد صاحبؒ نے جن چیزوں کی طرف خاص توجہ کی، وہ یہ ہیں:-

(۱) سب سے پہلے ارکانِ حکومت کی اصلاح کی طرف توجہ کی کہ ان کے دلوں میں دعوت جگہ پیدا کرے تو

پھر پوری قوم کا مائل ہو جانا دشوار نہیں۔ اور اس میں انہیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

(۲) انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام پر اس دور میں جو مصیبتیں آئی ہیں اور آ رہی ہیں ان میں علماء سوء کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بڑا دخل ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کی پردہ دری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اور اس کے مفید نتائج ظاہر ہوئے۔

(۳) اسی طرح انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے زمانے کے صوفیہ اکثر و بیشتر ویدانت کے فلسفے اور ہندو جوگیوں کی ریاضتوں سے متاثر ہیں، اور ان کی بڑی تعداد "وحدۃ الوجود" اور "ہمہ اوست" جیسے مشرکانہ عقائد کی قائل ہو گئی ہے۔ حضرت مجددؒ نے ان جاہل صوفیوں اور ان کے گمراہ کن عقائد اور خاص کر وحدۃ الوجود کی کھلم کھلا اور بے لاگ تردید کی۔ اور یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو اسلامی ہند کے فکری ارتقاء میں انہیں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے۔

(۴) عرصہ دراز سے جاہل واعظوں اور خوش عقیدہ مشائخ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جہاں انہیں کسی بدعت پر ٹوکا گیا، وہ بدعت حسنہ کی آڑ لے کر سامنے آ گئے۔ مجدد صاحبؒ نے شاید اسلامی ہند میں پہلی مرتبہ اس کا پردہ چاک کیا۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں واشگاف طریقہ پر بار بار بیان کیا ہے کہ بدعت بدعت ہے اور اس لیے ضلالت بھی۔ اس میں حسنہ اور سیئہ کا کیا سوال؟ لَیْتَ شِعْرِیْ مِنْ اَیْنَ حَکَمُوْا بِحُسْنِ الْبِدْعَةِ الْمُحْدَثَةِ فِی الدِّیْنِ الْکَامِلِ۔ مجدد الف ثانیؒ کا یہ کارنامہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ دیکھ کر مجدد صاحبؒ کے اس کارنامے کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے کہ "بدعت حسنہ" کے سلسلے میں بڑے بڑے علماء نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وحدۃ الوجود کی بے لاگ تردید اور بدعتِ حسنہ کی پردہ دری، مجدد صاحبؒ کے یہ ایسے شاندار کارنامے ہیں، جو نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پوری اسلامی فکر کی تاریخ میں انہیں خاص مقام عطا کرتے ہیں۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شیخ عبدالحق دہلویؒ ۹۵۸-۱۰۵۲ھ مجدد صاحبؒ کے تجدیدی کارناموں کے ساتھ ان کے صاحبِ علم معاصر شیخ عبدالحقؒ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کی ذات سے شمالی ہند میں علم حدیث